ڈاکٹر روش ندیم
صدر شعبہ اُردو۔ گورنمنٹ کالج ،اصغر مال کالج،راولپنڈی

بیسویں صدی کے اردو ادب میں عورت کے حقیقت پسندانہ تصور کا سماجی سیاسی مطالعہ

Dr. Ravish Nadeem

Head Urdu Department, Asgar Mall College, Rawalpindi

Social and Political study of Realistic Concept of Women in Urdu literature of twenteth centurey

Literary trend of realism was established in the larg scale in 1936 by the progressive movement. It gave a chance to literary persons to observe the real picture of woman of Indo-Pak. This trend also gave way to woman to act equally along with man. During last eighty years showed the literary and socio-political evolution of pakistani woman.

سرسید احمد خان سے اگلی نسل کا ذہنی ڈھانچہ اور حالات ان سے بالکل مختلف ہو گئے تھے۔اس نسل کے اپنے فکری و ادبی رجحانات تھے جو سجاد حیدر یلدرم کی رومانویت اور پریم چند کی حقیقت نگاری پر مبنی تھے جن کے ملاپ کے مختلف تناسبات بیسویں صدی کے اردو ادب کے ذیلی ادبی رجحانات کی صورت گری کرتے رہے۔حقیقت پسندی کے برعکس رومانویت نے عورت کے حوالے فکری و ادبی سطح پر سرسید اور ان کے رفقائے کار سے بغاوت کی لیکن اور کی ایک زندہ تصویر کشی کے باوجود اسے حقیقت کی بجائے خواب آور رومان کی نظر سے اسے جاننے کی کوشش کی۔ادب کے رومانویت پسند ادیبوں نے سرسید عہد سے پیدا کردہ تصورِ عورت اور عشق و حسن پر لگی پابندیوں اور نئی نوآبادیاتی اخلاقیات کے پیدا کردہ مصنوعی شرم و حیا کے تصورات کے خلاف آواز اٹھائی۔اس حوالے سے سجاد حیدر یلدرم کے ہاں نئی عورت کا ایک واضح تصور موجود تھا بقول انور سدید:''یلدرم کی عطا یہ ہے کہ اس نے اردو ادب کو تعلیم یافتہ عورت سے متعارف کرایا اور زندگی میں اس اہم کردار کو تسلیم کیا۔یلدرم نے اس خانہ نشین کو (جسے رسوا کوٹھے سے اتار کر خانہ نشین بنانے کے متمنی تھے) حریم ناز سے نکلنے اور اپنی لطافتوں سے زندگی عطر بیز کرنے راہ سجھائی۔''(۱) یعنی یلدرم نے عورت کے وجود کو تسلیم کر کے اسے مرد کے لیے ایک قوتِ محرکہ قرار دیا جبکہ نیاز فتح پوری نے اصلاحِ نسواں اور اصلاحِ معاشرہ کے ذریعے تبدیلی کا خواب دیکھا۔لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان رومانویوں کے ہاں ایک ایسی نئی حقیقی آئیڈیل عورت کا متبادل تصور ناپید رہا جو

معروضی سطح پر خود عورت کے لیے بھی تحرک کا باعث اور بدلتے ہوئے ہندستان کی نمائندہ ہوتی، البتہ وہ ڈپٹی نذیر احمد کی اکبری اور آغا حشر کی نیک پروین ہیروئینوں کے پرانے تصور کو توڑنے میں کامیاب رہے۔ رومانویوں کی فکری بغاوت کی نمائیدگی قاضی عبدالغفار کی ''لیلیٰ کے خطوط'' نے کی۔ اردو شعری روایت میں اختر شیرانی کی شاعری میں عورت کے حوالے سے قابل توجہ یہ ہے کہ بقول علی سردار جعفری ''اختر شیرانی نے اردو شاعری میں گوشت پوست کی عورت، معشوقہ اور محبوب تخلیق کی ہے۔'' (۲) یہ رفقائے سرسید سے پیدا شدہ اردو ادب میں انسانیت کے نصف کی کمی کو پورا کرنے کی ابتدا کی جس سے شعری ادب میں مکالمہ ممکن ہوا۔

ادب کا حقیقت پسند رجحان پریم چند کے ہاتھوں رومانویوں کے متوازی شروع ہوا جو بعد ازاں 'انگارے' سے ہوتا ہوا انجمن ترقی پسند مصنفین تک جا پہنچا تھا۔ پریم چند کی حقیقت نگاری اور انقلابیت پر مشتمل ذہنی ارتقا جس قسم کے طبقے، لوکیل اور موضوعات کے ساتھ آگے بڑھا وہ اپنی تکنیک کے باعث عورت کے مسائل کا بہترین عکاس تھا جس میں انہوں نے اپنے پیشرو ترقی پسندوں کی طرح جاگیردارانہ پدرسری کو بے نقاب کیا اور بے مرضی و بے جوڑ شادی، بیوگی اور تعلیم وغیرہ کے مسائل کو عورت کے حوالے سے پرکھا۔ آریہ سماج تحریک کے زیر اثر پریم چند عورتوں کی سماجی اصلاح، مرد و زن کی مساوات اور تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے۔ پریم چند نے جس حقیقت پسند ادب کا آغاز بیسویں صدی سے کیا تھا ڈیڑھ دو دہائیوں کے بعد ہی ہندوستانی نوآبادیاتی تضادات، آزادی و انقلاب کی تحریکوں اور بین الاقوامی حالات کے اثرات کے باعث وہ نئے شعور و نظریات کا تقاضا کرنے لگا تھا۔ ''انگارے'' (۱۹۳۲ء) اسی کی تمہید بنا جس میں تاریخی، طبقاتی اور سماجی شعور کو ردِعمل، احتجاج اور مزاحمت کے ساتھ پیش کیا۔ لیکن اس کی زیریں سطح پر فیمنائی انداز کی موہوم احتجاجی لہر بھی موجود تھی۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن:

> انگارے میں احتجاج دو موضوعات کے گرد ظاہر ہوا: ایک عورت، دوسرے مذہبی توہمات و تعصّبات۔ عورت یہاں مظلومیت کا نشان ہے چونکہ اس سے کچھ ہی پہلے رومانیت عورت کو پرستش کے سنگھاسن پر بٹھا چکی تھی۔ لہٰذا ''انگارے'' کے لکھنے والوں نے اس کا دوسرا روپ دیکھا جو جنس و تلذذ میں پھنسا ہوا ہے اور جس کے گرد استحصال کی زنجیریں ہیں۔ (۳)

اسی لئے ڈاکٹر شبنم آرا نے لکھا کہ ''ہم اردو ادب میں تانیثیت کی روایت کا باضابطہ آغاز ۱۹۳۲ء یعنی انگارے کی اشاعت ہی کو مانتے ہیں۔'' (۴) سرسید کی اگلی نسل نے ان کے نوآبادیاتی ہائی ماڈرنزم کا اینٹی تھیسس حقیقت پسندی اور ترقی پسندی کی صورت میں پیش کیا۔ ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل تک کے دور میں مغربی دنیا مارکسی اور اشتراکی فیمنیت سے گزر رہی تھی لیکن ہمارے ہاں چونکہ ترقی پسندوں کے نزدیک عورت کی حقیقی آزادی کا واحد حل انقلاب و آزادی کے ذریعے طبقاتی نظام کا خاتمہ تھا اس لیے ان کی نظر میں اصلاحِ نسواں یا حقوقِ نسواں کی وہ اہمیت تو نہیں تھی لیکن اس کے باوجود عورت کے مسائل و حالات کی نشاندہی جس انداز میں ترقی پسند ادب میں ہوئی وہ ہمیں اس سے پہلے دکھائی نہیں دیتی۔ دراصل ترقی پسندوں تک آتے آتے شہری سطح پر عورتیں تعلیم کے ساتھ ساتھ روزگار اور دیگر سماجی عمل میں شریک ہونے لگی تھیں۔ اس لیے ترقی پسندوں نے عورتوں کے مساویانہ حقوق کے ساتھ اسے تعلیم یافتہ، برسرِ روزگار اور آزادی کے سپاہی کا درجہ دیا۔ بقول نسرین انجم بھٹی ''ترقی پسند ادب میں پہلی

بارعورت کو دلیری سے زندگی کے اشتراکی عمل میں اشتراکی فلسفے کی نسبت کے ساتھ ساتھ کامریڈ انسان عورت کے روپ میں سامنے لایا گیا۔اس کے دکھ درد کو، دکھ درد کے ساتھ برابری دی گئی اور طبقاتی سطح پر زندگیوں کا احتساب کیا گیا۔(۵) جبکہ بقول ڈاکٹر سلیم اختر:''ترقی پسند ادب کی تحریک نے بھی خواتین قلمکاروں کو مساوی حیثیت دیتے ہوئے پلیٹ فارم مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ جرائد میں اشاعت کی سہولتیں فراہم کیں۔''(۶) حقیقت نگاری اور فطرت نگاری کے ذریعے استحصال زدہ طبقات کے مسائل تک رسائی نے پریم چند، بیدی، منٹو، کرشن اور ساحر کو پسماندہ طبقات کی عورت پر قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔یوں تو رسوا سے منٹو تک عورت اور طوائف کے سماجی تضاد کے زاویے سے عورت اور اس کے مسائل کو دیکھنے کی کوشش کی جاتی رہی لیکن پھر بھی منٹو ہی پہلا فیمنائی افسانہ نگار کہلایا جس نے عورت کی ذہانت، جرأت اور مزاحمت کو دریافت کیا۔منٹو کے ہاں عورت کا مکمل احترام اور ہمدردی ہے اور وہ اسے مکمل انسان تسلیم کرتا ہے۔بیدی کے ہاں عورت کے ساتھ زیادتی کا دکھ بہت واضح ہے لیکن اس ہمدردی کے باوجود اس کے ہاں عورت کا مکمل انسانی روپ ظاہر نہیں ہوتا۔ترقی پسندوں میں فیض صاحب عورت کے ساتھ باوقار، پرخلوص، باوقار اور باوفا رشتہ قائم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

ترقی پسندوں کے متوازی جدیدیت پسند یورپی ادبی افکار اپنانے والوں میں تصدق حسین خالد، ن م راشد، میراجی، ضیا جالندھری، غلام عباس، عزیز احمد، حسن عسکری، ممتاز مفتی وغیرہ شامل تھے۔۱۹۳۹ء میں حلقہ ارباب ذوق کی بنیاد رکھنے والے یہ جدیدیت پسند درحقیقت سرسید احمد خان کے ہائی ماڈرنزم کے منکر اور یورپی صنعتی سرمایہ داری کی نمائندہ جدیدیت کے مقلد تھے یعنی یہ پہلا ادبی فکری رجحان تھا جو سرسید کے تشکیل کردہ اجتماعیت، سماجی ذمہ داری اور قومی اصلاح کے کردار کی بنیادوں کا انکاری تھا۔حالانکہ نوآبادیاتی دور میں جدیدیت پسندی کی یہ وہ روایت تھی جسے سرسید مخالف اودھ پنچیوں، اقبال پسندوں، ترقی پسندوں حتی کہ مجموعی طور پر رومانویوں نے بھی آگے بڑھایا تھا۔گو یہ ادب میں قومی سوال کے غلبے کا بھی نتیجہ تھا کہ جس میں عورت کا سوال دبتا ہی چلا گیا۔انسان سے قوم اور عوام سے پرولتاریہ تک عورت کی ادب میں آمد مہمان ومعاون اداکار کے طور پر ہی ہوتی رہی۔مگر انفرادیت پسند جدیدیوں کے ہاں بھی عورت ان کی داخلی ووجودی کائنات سے باہر نہیں رہی۔ان کے ہاں عورت کا مسئلہ بطور ایک سماجی ادبی تنازعے یا فکری جہت کے تو نہیں آیا البتہ بالواسطہ طور پر بعض ادیبوں کے ہاں بلواسطہ تصویر کشی ضرور ہوئی جیسے ن م راشد، ممتاز مفتی، عزیز احمد، غلام عباس، اشفاق احمد وغیرہ کے ہاں۔ن م راشد کی جدیدحسیت میں بھی عورت قدیم ہی رہتی ہے وہ مرکزی کردار نہیں بنتی، اگر وہ آتی بھی ہے تو''انتقام''اور''مسز سالا مانکا''کے کرداروں میں۔ممتاز مفتی تو عورت کو ایک بے دماغ اور پھول جیسی چیز کے علاوہ تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں۔وہ جارحیت پسند یا جنسی وروایتی عورتوں کو ہی اپنے ہاں نمائندگی دیتے ہیں۔عزیز احمد کی عورت مرد کے لیے محض سیکس ڈول رہی۔

بیسویں صدی کی دوسری نسل کی نمائندہ ڈاکٹر رشید جہاں اردو کی پہلی افسانہ نگار اور ترقی پسند سائنسی وانقلابی فکر کی حامل دلیر خاتون تھیں جس کا اظہار'انگارے'سے ہی ہو جاتا ہے۔ترقی پسندوں میں ادا جعفری جدید اردو شاعری میں باضابطہ خاتون شاعرہ کے طور پر ابھریں اور پہلی دفعہ باقاعدہ ایک عورت کی شاعری کر کے اپنی باوقار جگہ بنائی۔ادا جعفری اور اس کی ہمعصروں نے بھی اپنی

پیش رو خواتین ادیبوں کے لیے راستہ ہموار کیا اور بقول پروین شاکر ادا جعفری نے میرے راستے کے کانٹے چنے تھے۔ رضیہ سجاد ظہیر کے ناولوں میں عورت ایک نئی سوچ اور طاقت کے ساتھ سامنے آئی۔ واجدہ تبسم نے جاگیرداروں کے ہاتھوں ان کی نوکرانیوں اور خادماؤں کے جنسی استحصال کو قلمز د کیا۔ ترقی پسند خواتین کے ہاں بانجھ، بیوہ، غیر شادی شدہ اور ملازم عورتوں کے مسائل پیش کیے گئے۔ اسی دور کی صدیقہ بیگم، حاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کا فنی و فیمنائی شعور ترقی پسندی کا ہی تسلسل تھا۔ ان کے ہاں عورت گھر سے باہر پھیلے رواجی جبر سے آزادی کے لیے کوشاں ہے۔ جبکہ عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے ہاں عورت ایک اور زاویے سے زیر بحث آئی جس میں وہ اصلاحِ نسواں اور حقوقِ نسواں سے آگے بڑھ کر آزادیِ نسواں کی قائل ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے ہاں بے بس و محروم عورت کے ساتھ ساتھ دنیا کی تہذیب و تغیرات سے آشنا خواتین بھی پیش کی گئیں۔ جدید یورپی اقدار پر مشتمل مردوں کے شانہ بشانہ حصول تعلیم اور آزادی پر مشتمل فیمنیت کا روشن خیال اور لبرل ماڈل قرۃ العین حیدر کے ہاں نظر آتا ہے جو پدرسری نظام کے خلاف بنیادی تبدیلی کا تقاضا تو نہیں کرتا البتہ عورت کے حوالے سے اعلیٰ طبقے کی نئی اقدار کے تحت ترقی کے لیے اہمیت کا حامل ہے۔ جبکہ عورت کی کامل آزادی کی حامل وہ فکر جو پدری نظام کو براہِ راست چیلنج کرتے ہوئے مساویانہ کردار کا مطالبہ کرتی ہے اس کی اول اول صورتیں عصمت چغتائی کے ہاں ملتی ہیں۔ اس دور میں اس ریڈیکل انداز فکر کا عصمت کے ہاں تشکیل پانا حیرت انگیز ہے۔ ایسے ہی فکری رویوں نے بعد ازاں فیمنائی تحریکوں اور مابعد جدید مفکرین کے ہاں باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کی۔

نوآبادیات سے آزادی اور نچلے طبقات کے انقلاب کے حق میں جو فضا پچھلی دو تین دہائیوں سے بنی ہوئی تھی اس میں خواتین بھی ہر حوالے سے ہراول دستے کا حصہ تھیں۔ یہ عورت کی سماجی سیاسی بیداری اور فعال کردار کا شاندار دور تھا۔ لیکن ہندو، مسلم ،سکھ اور عیسائی عورتوں نے قتل، اغوا، تشدد، عصمت دری، تذلیل جیسے جس سلوک کا سامنا فسادات کے دوران کیا اور اس تمام تر جدوجہد کے بعد مذہبی طبقے کی طرف سے اپنے حقوق کے لئے جو دباؤ سہا اس نے پاکستانی عورت کو اپنے مادر وطن میں ایک نئی صورت حال سے دوچار کر دیا۔ اس پر مزید یہ کے ہجرت و غربت کی پریشانیوں نے خاندان کے ڈھانچے اور اس کی روایات میں دراڑیں ڈالنا شروع کر دیں۔ مجموعی طور تقسیم ہند کے عظیم تر تغیر کے نتیجے میں جو حالات ابھرے اس نے عورت کو نئے چیلنج اور امکان سے دوچار کیا:

> برصغیر کی تقسیم نے پدرسری خاندان پر گہرے اثرات مرتب کیے جو اردو ادب کے صفحوں پر سانس لیتا تھا۔ بیسویں صدی کی ایک عظیم اور خونیں نقل مکانی شمالی ہند اور پنجاب میں رونما ہوئی اور اس نے ہمارے پدر سری سماج کے طبقے الٹ دیے۔ 'پردہ' جو مسلم خاندانی نظام کا ایک بنیادی ستون تھا اس میں دراڑیں پڑ گئیں، معاشی ضرورتوں کے تحت عورتوں کا گھروں سے باہر نکلنا، لڑکیوں کا تعلیم حاصل کرنا اور متحرک ہونا انہیں گھر کے دائرے میں قید کر کے رکھنے والوں کے لئے ناگزیر ہو گیا۔ چنانچہ پدرسری خاندان نے 'نظریہ ضرورت' کے تحت اس نئی اور ناخوشگوار صورت حال کو برداشت کر لیا کہ اسی میں عافیت تھی۔ اس صورت حال کے اثرات ادب پر بھی مرتب ہوئے۔ (۷)

افسر شاہی اور جاگیرداری تائید سے قراردادِ مقاصد پر تشکیل شدہ نئی پاکستانی ریاست کی آئینی بنیاد میں بعدازاں عسکری طاقت کی شمولیت نے ملک کے سیاسی مستقبل اور کردار کا تعین کیا جو روس مخالف امریکی معاہدات کے بعد واضح ہو گیا تھا۔ گو بیگم لیاقت علی خان کی طرف سے پاکستانی عورتوں کے لئے بنائی جانے والی تنظیموں اور فورموں اور ۱۹۵۶ء کے عورتوں پر قانون سازی کے لئے تشکیل کردہ کمیشن کی مذہبی گروہوں کی طرف سے شدید مخالفت کی گئی لیکن اگلے بیس سال عورتوں کے آئینی و قانونی سطح پر جیت کے حوالے سے شاندار رہے۔ پاکستانی تاریخ کے ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ تک کے اولین دور میں جنرل ایوب کے آمریت میں صنعتکاری کے تحت سیکولر جدیدیت اور ۱۹۶۹ء کی عوامی تحریک کے نتیجے میں بھٹو کی جمہوریت نے سیاسی سطح پر ماڈرنزم اور اشتراکیت کے اتحاد کو فروغ دیا۔ یہ اولین پاکستانی دور خواتین کی فتوحات کا شاندار دور تھا۔ اس میں مشرقی پاکستان کی بنگالی خواتین کی قومیت، زبان، حقوق اور فوجی آپریشن کے حوالے سے جدوجہد نے بھی بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ اس دور میں فاطمہ جناح سیاسی سطح پر عورت کی علامت کے طور پر ابھری تھیں۔ ۱۹۶۱ء کے عائلی قوانین اور ۷۳ء کے آئین کے تحت مساویانہ حقوق کے ضمن میں عورت کو آئینی سطح پر ایک درجہ تحفظ اور خواتین کی تحریک و شعور کو مہمیز دی گئی جو آئینی سطح پر عورتوں کی ایک بڑی فتح تھی۔

۱۹۷۷ء کے بعد سے دوسرے پاکستانی دور میں فوجی آمر جنرل ضیا نے افغان جہاد کے پس منظر میں اسلامائزیشن کے تحت متشدد مذہبی رجعت پسندی کو فروغ دیا گیا۔ عورتوں کے مساوی حقوق کا آئین معطل کر کے اسلامی قوانین اور اسلامی سزاؤں کے آرڈیننس کے تحت قانونِ شہادت، حدود آرڈیننس اور عورتوں کے لئے کوڑوں کی سزا کے ذریعے ان کی ایک سو سالہ جدوجہد کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی گئی۔ جس نے پاکستانی ریاست اور معاشرے کی تشکیل پہلے دور کے بالکل برعکس مذہبی رجعت پسند بنیادوں پر کی۔ اس دور میں عورتوں کے متحدہ محاذ نے ویمنز ایکشن فورم کے تحت مزاحمت کا آغاز کیا۔ اس دور میں بے نظیر بھٹو سیاسی سطح پر عورت کی علامت بنی۔ عورتوں نے اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ ایم آر ڈی کی صورت میں جمہوریت کے لئے بھی جدوجہد کی اور اس کے نتیجے میں قید، تشدد، جیل، کوڑوں، جلاوطنی، جس بے جا قتل، اغوا جیسے اقدامات کا سامنا کیا۔

سیاسی و آئینی جدوجہد اپنی جگہ لیکن مجموعی طور پر پاکستانی عورت ایک سخت گیر پدرسری برادری نظام کے حامل معاشرے کا حصہ ہے۔ اس لئے مردانہ احکام، کمیونٹی، اور برادری نظام کے اصول وضوابط، اس کپنچایتی فیصلوں کا شدید جبر اسے تمام تر سماجی حیثیتوں میں مرد کی ملکیت بنائے رکھتی ہے۔ حتٰی کہ بعض سماجی گروہوں اور طبقوں میں تو وہ ایک قابل خرید و فروخت ہونے کے باعث پاکستانی کے کئی شہروں اور علاقوں میں ایک منافع بخش کاروبار بھی ہے۔ بقول حمزہ علوی ''دیہی معاشرہ ہو یا شہری، پاکستان میں معاشرتی نظام بڑی سختی سے مردانہ ہے جہاں عورت ایک حاصل اور قبضہ کی گئی نجی ملکیت تصور کی جاتی ہے۔'' (۸) ایسے جاگیردارانہ تانے بانے میں عورتیں وٹہ سٹہ، کاروکاری، سوارا، جلاؤ گھیراؤ، تیزاب گردی، قرآن سے شادی، بدسلوکی، تشدد، ہراساں کرنا، برہنہ جلوس، قتل، اغوا، جسم فروشی، زنا بالجبر کے علاوہ عصمت دری و شادی بطور بدلہ، تاوان، قرض، تجارت اور انتقام شہری و دیہی دونوں سطح پر جاری و ساری ہے۔ ان وجوہات کے علاوہ صحت کے مسائل، کم خوراکی، گھریلو بندشیں، نفسیاتی دباؤ اور دوران حمل و پیدائش تکلیفوں کے باعث ان کی شرح اموات مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

دو تین کاسمو پولیٹن شہروں کی مخصوص اپر کلاس کو چھوڑ کر خاندانی روایات واصولوں کا جبر مجموعی طور پر بہت زیادہ ہے۔ اپر کلاس اور نئی خوشحال کلاس کی عورتیں ملازمت و کاروبار جیسی معاشی سرگرمیوں کا تقاضا نہ ہونے کے باعث طلاق اور خوشحالی چھن جانے کے خوف کی وجہ سے گو مردوں کی دست نگر رہتی ہیں۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خواتین بھی تعلیم، عزت، شناخت، سہولیات اور مرتبے کے لئے ملازمتیں اختیار کرنے لگیں۔ ان خواتین کے علاوہ پاکستانی عورتوں کو ان کے سماجی کردار و حیثیت کے اعتبار سے دیہی اور شہری کے علاوہ ناخواندہ اور تعلیم یافتہ میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ان میں عورتوں کی مزید تقسیم کو بھی مدنظر رکھنا چاہیئے مثلاً کھیت سے وابستہ اور غیر وابستہ چھوٹے موٹے کام کر کے گزارا کرنے والی دونوں اقسام کی عورت، تعلیم یافتہ ملازمت کرنے والی اور غیر تعلیم یافتہ چھوٹے موٹے کام کرنے والی دونوں اقسام کی عورتیں۔

قیام پاکستان کے بعد بھی خاندان میں مشترکہ مردانہ معاشی سرگرمیوں خاندانی کفالت مشترکہ خاندانی نظام اور اس کا مضبوط نظام جاری رہا جس میں عورت دیہاتوں کے مقابلے میں پر شہروں میں چادر چاردیواری اور گھریلو خدمت ومحنت کی شدید پابندیاں تھیں۔ غربت، روزگار اور کاروبار کے ہاتھوں دیہاتوں سے شہروں کی طرف انتقال آبادی درحقیقت پدرسری خاندانوں کے ٹوٹنے کا آغاز بھی ٹھہرا۔ دیہاتوں کے بڑے خاندان جو مرد عورت کی اجتماعی کھیت مزدوری کے باعث شدید طور پر جڑا ہوا تھا، شہروں میں آکر چھوٹے چھوٹے یونٹوں میں بٹنے لگا۔ جس سے مردانہ و برادری نظام کے خاندانی شکنجے بھی کمزور پڑنے لگے جس کا سب سے زیادہ فائدہ عورت کو ہوا۔ پردہ، برقعہ اور حجاب کی پکڑ ڈھیلی پڑنے لگی۔ یہ خاندان مہنگائی کی شدت اور قومی غربت کے مقابلے کے ساتھ ساتھ اچھے رشتوں کی تلاش کے باعث عورت کی ''محفوظ'' تعلیم اور ملازمت کے لئے مجبور ہوئے اور عورت گھر سے باہر کی سماجی زندگی میں شریک ہونے لگی۔ اولاً نرسنگ اور ٹیچنگ جیسی ''مردانگی سے محفوظ'' ملازمتوں کو قبول کیا گیا۔ مگر شدید مقابلے اور غربت کے باعث دفتری نوکریاں بھی شہروں میں اپنائی جانے لگیں۔ یوں پرانا سماجی نظام ٹوٹنے لگا۔ اس نئی تبدیلی سے پاکستانی مرد عورت کے مابین شناخت، مرتبے اور اتھارٹی کا نیا مقابلہ شروع ہو گیا۔ جبکہ پنجاب کے جن وسیع بارانی علاقوں میں لوگ فوج میں جاتے ہیں یا روزگار کے لئے دوسرے شہروں یا ملکوں میں منتقل ہو جاتے ہیں وہاں کی عورتوں کو گھریلو کے ساتھ ساتھ معاشی سرگرمیوں کا بوجھ بھی اٹھانا پڑتا ہے۔ جبکہ نہری علاقوں کی خواتین کو آہستہ آہستہ معاشی گرمیوں اور نتیجتاً ان کی سماجی موومنٹ و سماجی کردار سمٹتا چلا گیا۔ برقعہ عام ہوا اور گھریلو خدمت گزاری بڑھ گئی۔ گویا خوشحالی اور تعلیم دونوں نے عورت کی سماجی حرکت کو محدود کیا۔

بے تعلیم اور ناخواندہ خواتین گھریلو مزدور، دہاڑی دار چھوٹی ملازمت یا محنت کشی کے ساتھ ساتھ گھروں میں آرڈر پر مال تیار کرنے یا سلائی کڑھائی اور پیکنگ جیسے پیشوں سے وابستہ ہوتی ہیں۔ گویا یہ خاتون خاندانی و سماجی استحصال کے علاوہ معاشی لوٹ مار کا بھی شکار ہونے لگیں جو کہیں معاون و منتظم شوہر، باپ اور بھائی کے ہاتھوں اور کہیں مالک اور انتظامیہ کے ہاتھوں۔ اسے گھریلو اور اقتصادی خدمات دونوں نبھانی پڑتی تھیں۔ اس شدید دباؤ کے باعث وہ سماجی تحریکوں اور مظاہروں کا حصہ بن پائیں۔ یوں عورتوں کی تحریکوں کی قیادت مقابلتاً خوشحال اپر یا اپر مڈل کلاس کی رہنمائی میں چلی گئیں۔ جن کے متوازی سول سوسائٹی یا این جی او کی عورت بھرپور اعتماد کے ساتھ سامنے آئی۔

تعلیم، ملازمت اور شعور کے حوالے سے یہ نئی پاکستانی عورت ہی تھی جس نے جنرل ضیاء الحق کی اسلامائزیشن کو اپنی نئی جدوجہد اور ترقی کی راہ میں خطرہ محسوس کیا۔ حدود آرڈننس اور قانون شہادت جیسے اقدامات نے مرد کے مقابلے میں عورت کی حیثیت پھر سے آدھی کر دی اور انہیں تعلیم، قانون، آزادی اور خودمختاری رستے سے بھٹکانے کی کوشش کی گئی۔ پاکستانی عورتوں کو فحاشی و عریانی کے پروپیگنڈے میں لا کر انہیں محض خواتین تعلیمی اداروں، مضمونوں کے ساتھ ساتھ پردوں، برقعوں اور گھروں تک محدود کر کے سماجی سیاسی سرگرمی اور اجتماعی عمل سے کاٹ کر غیر سیاسی کر دیا جائے۔ وومن سکول، وومن کالج، وومن یونیورسٹی، وومن بینک، وومن پارک جیسے ضیائی اقدامات نے برصغیر میں انگریزی اقتدار کے تحت جدید شعور کے زیر اثر عورت کی گزشتہ ڈیڑھ سو سالہ جدوجہد کو چیلنج کرتے ہوئے اسے واپس مردانہ گھریلو قید کی طرف دھکیلنے کی ایک کوشش کی جس کے خلاف نئی پڑھی لکھی عورت نے زبردست ردعمل دیا۔

ادبی سطح پر قیامِ پاکستان کے وقت ترقی پسند اور جدیدیت پسند فکری ادبی دبستانوں کا ہی دور دورہ تھا۔ پاکستان کی اولین دہائی میں سابقہ ادبی تسلسل تقسیم و فسادات کے موضوع کے ساتھ جاری رہا۔ جنرل ایوب کے دور میں ترقی پسندوں پر پابندی کے بعد مغرب معاون صنعت کاری کی فکری بنیادیں ۶۰ء کی جدیدیت پر رکھی گئیں۔ جدیدیت پسند ادیبوں میں سارتر کی ''انقلاب پسند وجودیت'' نظریاتی اساس کے طور مقبول ہوئی۔ ایوب دور کا جدیدیت پسند ادب اپنے اگلے مرحلے میں بھٹو کے جمہوری اشتراکی دور میں ماڈرن رئیلزم کی طرف ارتقا پذیر ہوا جو دراصل انفرادیت پسند وجودیت سے عوامی اجتماعیت کی طرف فکری ارتقا کا سفر تھا، جس نے نیولیفٹ، نیولبرلزم، نومارکسیت اور نوترقی پسندی کے لیے راستہ ہموار کیا۔ نتیجتاً جدیدیت پسندی کی انفرادیت و داخلیت کی جگہ پھر سے سماجی وطبقاتی شعور نے لے لی۔ اسّی کی دہائی میں یہ فکری رجحان اشتراکی زوال کے بعد مابعد جدیدیت کی صورت میں ڈھل گیا۔

پہلے جدید پاکستانی دور میں بھٹو اور ایوب کا عہد روشن خیالی و ترقی پسندی کا دور تھا جہاں اپوا جیسی خواتین کی فلاحی اصلاحی تنظیمیں فعال ہوئیں حتیٰ کہ خواتین کے لیے خواتین کے ذریعے خواتین کے خودمختار ادارے وجود میں آئے۔ ۱۹۶۰ء سے عالمی سطح پر خواتین کی فیمنائی تحریک نے ادبی مطالعے اور سماجی فکری جہت کا زاویہ بدل دیا تھا۔ فیمنیت نے جدیدیت کے بنیادی عنصر کے طور پر ایک فکری دبستان کی حیثیت سے علوم میں جگہ بنائی۔ ساٹھ کی دہائی کا اہم ادبی واقعہ سجاد ظہیر کی ترقی پسندی اور ن م راشد کی جدیدیت کے خلاف نئی جدیدیت کا ابھار تھا۔ ادب میں افتخار جالب، جیلانی کامران، سلیم الرحمٰن، وزیر آغا، قمر جمیل، انور سجاد، انتظار حسین جیسے لوگ جدیدیت پسند ادب کی فکر لے کر آگے بڑھے، جنہیں بعد ازاں سرمد صہبائی، عبدالرشید، زاہد ڈار، رشید امجد، منشا یاد جیسے پیروکار ملے۔ جدید تر مغربی ادب سے شدید جڑت کے باوجود ان سب کے ہاں ادبی سطح پر عورت کا سوال ناپید تھا۔ اردو ادب کے علامتیت، تجریدیت، لایعنیت، اظہاریت، تاثریت، ڈاڈایت وغیرہ کے جدیدیت پسند ہیئتی رجحانات نے عورت کا محض منتشر، نامکمل اور غیر واضح امیج پیش کیا۔ چونکہ رئیلزم کے برعکس ماڈرنزم میں ہیئت اور تکنیک کو وجودی مسائل کی ہم آہنگی کے ساتھ غلبہ حاصل تھا، اس لیے جدیدیت پسندوں کا ورلڈ ویو عقلیت پسندی اور روشن خیالی کے تسلسل میں ابھرنے والی یورپی جدیدیت سے کافی حد تک مختلف تھا۔ تقسیم ہند تک مرد ادیبوں کا غالب رجحان عورت کو مجموعی طور پر شاعری میں حسن و عشق کی دیوی اور جنس کے منبع کے

طور پر پیش کرنے کا رہا جبکہ افسانوی ادب میں اسے کمزور، لاچار، شادی اور چار دیواری کے مسائل میں الجھی یا نئے تمدن کے مسائل سے دوچار دکھایا گیا لیکن عورت کے انسانی و آزادانہ وجود اور ذاتی تشخص کی ایسی مکمل تصویر کبھی پیش نہ کی گئی جس سے عورت کے متعلق مردوں کی خفتہ تمناؤں پر مشتمل داخلی تصور کا غمازی ہوتی ہے۔ البتہ ترقی پسندوں سے شروع ہونے والا ادب ۶۰ء کی دہائی کے جدیدیت پسندوں تک آتے آتے بالواسطہ طور پر پدرسری خاندان کی ٹوٹ پھوٹ کا عکاس بنا رہا۔ اب ڈپٹی نذیر کی طرح خاندان اساس ادب کی جگہ فرد اساس ادب نے لے لی۔ منٹو اور عصمت کی کہانیوں سے عورت کے مطالعے کے حوالے سے شہری سطح پر پدری خاندانی انحطاط اور پدری سماجی توڑ پھوڑ کی جو بحث تخلیقی ادب میں شروع ہوئی تھی وہ ہجرت و فسادات کے خونی انتشار کے بعد فرد کے وجودی المیے تک سمٹ کر رہ گئی۔ یہ شہری سطح پر بدلتے ہوئے پاکستانی سماج کا اظہار تھا۔

۶۰ء کی دہائی اور اس کے بعد شہری سطح پر ثقافتی و اخلاقی صورتحال بڑی حد تک بدلنے لگی۔ ریڈیو، ٹی وی، فلم، ادب، صحافت اور دیگر فنونِ لطیفہ کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی خواتین آگے بڑھنے لگیں۔ عورت کی تعلیم، ملازمت، شادی، طلاق، بچوں اور جائیداد کے حوالے سے اس کے نقطۂ نظر کا اظہار سگھڑاپے، گھریلو پن، بے وفائی اور ہجر کے معاملات پر غالب آنے لگے۔ اصلاحِ نسواں اور حقوقِ نسواں کی تعلیمی و سماجی بیداری کے اگلے مرحلے یعنی آزادیِ نسواں میں خواتین مختلف شعبوں میں مرد کے شانہ بشانہ نظر آنے لگیں جس سے عورتوں میں اعتماد بھی بڑھا اور ان کی صلاحیتیں بھی سامنے آنے لگیں۔ بقول سلیم اختر ''پانچویں اور چھٹی دہائی کے بعد آنے والی شاعرات کو یہ سہولت حاصل ہوگئی کہ قارئین اور ناقدین (یعنی سماج) نے بھی عورت کو ذہنی طور پر بحیثیت آزاد تخلیق کار تسلیم کرلیا۔ یوں مردوں کی مانند عورت کی تخلیق کاوشوں کا بھی سنجیدگی سے مطالعہ کیا جانے گا۔''(۹)

۱۹۶۰ء کے بعد دو طرح کے رجحانات کی شاعرات سامنے آئیں: ''اولاً تو یہ کہ ایسی خاتون شعراء جنہیں مرد کی حاکمیت پر سوالیہ نشان لگانا اور ان تمام فکری ڈھانچوں کو توڑنا جو عورت کو محکومیت کے درجے پر متمکن کرتے ہیں زیادہ مرغوب رہا اور ثانیاً ایسی خاتون شعراء جنہوں نے خود سپردگی کی لذت میں رشتوں کے توازن کو برقرار رکھتے ہوئے نسائی فکر و احساس کو شعر کے قالب میں پیش کیا۔''(۱۰) کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، سارہ شگفتہ، پروین شاکر وغیرہ کے ہاں ان رویوں کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

> اردو ادب میں پہلی بار رشید جہاں اور ان کے بعد عصمت چغتائی اور عصمت کے بعد سیدہ حنا تک بے شمار فکشن نگار خواتین ہیں جنہوں نے عورت کے وجود، اس کی حسیت، اس کی ذہنی و نفسیاتی پیچیدگیوں اور مطالبوں نیز خاموشیوں کو قوت گویائی عطا کی۔ اب وہ پروفیشنل ہے مردوں کے درمیان مردوں کی مکاریوں اور سازشوں سے آگاہ ذمہ دار اور فہیم، اس کی اپنی رائے ہے۔ نظریہ ہے تصور ہے، یہ لے جدید شاعرات کے یہاں بھی پوری شدت کے ساتھ کارفرما ہے۔ کہیں پست کہیں بلند کہیں خفیف اور کہیں محیط۔(۱۱)

بقول سیمون دبوار چونکہ عورت پیدا نہیں ہوتی بلکہ بنا دی جاتی ہے(۱۲) اور یقیناً اس میں پدرسری نظام کی زبان کا کردار بہت بنیادی ہے۔ ہماری خاتون لکھاری مردانہ نام اور تذکیر کے صیغے کے ساتھ لکھتی ہوئی آگے بڑھی تھی۔ گھر کی محدود فضا اور کھڑکی

بھرافق اس کا معروض تھا جس میں پدرسری نظام کی حاکمیت تھی۔ ایسے میں مکالمے، عمل اور کردار کی بجائے خودکلامی، خواہش وخواب کا آجانا حیرت انگیز نہ تھا۔ یہی کچھ ادب میں بھی در آیا۔ عورت کے لیے ادب کی مردانہ روایت کی نقالی کرتے کرتے اپنا اسلوب وفکر اور موضوع ومسئلہ بنانا آسان نہیں تھا۔ لیکن ہماری لکھاریوں نے مرد کو بتایا کہ مکمل عورت کیا ہوتی ہے۔

صدیقہ بیگم، خدیجہ مستور، حاجرہ مسرور، جمیلہ ہاشمی، سائرہ ہاشمی، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، رضیہ فصیح احمد، ممتاز شیریں، الطاف فاطمہ، نثار عزیز بٹ، بیگم اختر ریاض الدین، خالدہ حسین، بانو قدسیہ، سیدہ حنا، فرخندہ لودھی سے لے کر نیلوفر اقبال، عذرا اصغر، نیلم احمد بشیر اور زاہدہ حنا تک نثر نگار خواتین کی ایسی کھیپ سامنے آئی جنھوں نے بطور خواتین مکمل اعتماد کے ساتھ رپورتاژ، افسانہ، ناول، ڈراما، آپ بیتی، سفرنامہ کے ساتھ ساتھ ادبی وسماجی سیاسی فیمنائی تنقید کے ضمن میں بھرپور کام کیا۔ حتّٰی کہ ٹی وی اور ریڈیو ڈراما کی اصناف میں حسینہ معین، فاطمہ ثریا بجیا، نورالہدٰی شاہ جیسی لکھاریوں نے بھرپور نام کمایا۔

گوفیمنیت کے مطالعے میں نثری ادب کو اولیت حاصل رہی لیکن بطور ادیب اپنی شعری روایت میں رہ کر نئی تاریخ رقم کرنے والی خواتین میں کشور ناہید، زہرہ نگار، سارہ شگفتہ، فہمیدہ ریاض، شبنم شکیل، پروین فنا سید، پروین شاکر، نسرین انجم بھٹی، نوشی گیلانی، شاہدہ حسن، فاطمہ حسن، عذرا عباس، منصورہ احمد، شاہین مفتی، تنویر انجم اور ثمینہ راجہ جیسی بے شمار شاعرات نے مختلف شعری اصناف میں مختلف تکنیکی رجحانات کے ساتھ بطور عورت اپنے انتہائی صنفی احساسات کے ساتھ داخلی وخارجی آفاق کو جرأت وبے باکی سے پیش کیا۔ احتجاج، مزاحمت اور لب ولہجے کے حوالے سے کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کی شاعری اسی جرأت وبے باکی اور فیمنائی شعور کی مثال ہے۔ کشور کے ہاں اگر فیمنائی شعور، احتجاج، مزاحمت اور تلخی کا روپ دھارتا ہے تو فہمیدہ کے ہاں فرائیڈ اور مارکس کا ادغام یہ صورت اختیار کرتا ہے۔ گو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستانی خواتین ادیبوں کے ہاں محدود سماجی وجذباتی تعلقات ومتعلقات کی کشاکش اور خواہشوں خوابوں کی ٹوٹ پھوٹ پر مبنی احساسات ان کی تخلیقات کا خام مواد ہیں۔ وہ اپنے روایتی ذہنی، جذباتی اور اخلاقی دائرے کے خلاف مجموعی بغاوت کی طرف بہت زیادہ مائل نہیں مگر یہ تمام وہ خواتین تھیں جنھوں نے پیشہ ورانہ سطح پر بھی ایک آزاد زندگی گزارنے، زندگی کے متعلق اپنا ایک نقطۂ نظر وضع کرنے اور اپنی ترجیحات پر زندگی گزارنے کی اپنی سی کوشش کی۔ یہ خواتین کسی نہ کسی درجے میں مغربی فیمنائی تحریکوں سے بھی آگاہی حاصل کرتی رہیں اور متاثر بھی ہوئیں۔ وہ میری وولسٹون، ورجینا وولف، سیمون دبوار اور جولیا کرسیٹوا کے نقطۂ نظر تک آگاہی کے باوجود معروضی جبریت کے خلاف کسی نہ کسی درجے کی مزاحمت کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس لیے بہت سارے مراحل میں یہ آزادیِ نسواں کے ہمعصر مغربی تحریکی رویوں یعنی مارکسی، اشتراکی، ریڈیکل فیمنیت کی طرف مائل ہوتی بھی نظر آتی ہیں۔

پاکستان کے دوسرے دور کی عورتوں کا شہری طبقہ تعلیم اور روزگار کے ساتھ ساتھ سماجی میدان میں کافی آگے بڑھ گیا تھا۔ لہٰذا اس بڑی تبدیلی کے ساتھ ساتھ مردوں کے ساتھ ساتھ لکھاریوں کی اگلی کھیپ کے ہاں عورت کا تصور وکردار، مسائل، موضوع، آزادی اور حقوق کا تصور وسیع تر ہونے لگا۔ شہری سطح پر عورت بنیادی حقوق حاصل کر کے:

---جب وہ ترقی کی اگلی منزل کی طرف گامزن ہے تو اس کے بدلتے معاشرے اور بدلتے رول میں

دوسری نوعیت کے مسائل درپیش ہیں مثلاً مردوں کے ساتھ کام کرنے کے مسائل، آزاد تعلیم یافتہ خودمختار عورت کے گھریلو مسائل، صدیوں سے عورت کے کمتر حیثیت کے تصور کی وجہ سے مرد اور عورت کا ٹکراؤ، اس سلسلے میں مردوں کی نفسیاتی گتھیاں، جذباتی طور پر مردوں کا ان کو بلیک میل کرنا، آزادی کے نام پر ان کا مختلف سطحوں پر استحصال۔ (۱۳)

یہ وہ معاملات ہیں جو ادب میں ایک نئی عورت اور اس کی دنیا کو متعارف کراتے ہیں۔ یہ نئی پاکستانی عورت ادیب اپنی نسوانیت کو عیب یا کمتری و کہتری نہیں بلکہ حسن اور صلاحیت سمجھتے ہوئے پراعتماد نظر آتی ہے اور اپنی شخصیت اور تخلیقی واردات واظہارات میں اس نسائی انفرادیت کو پدری صورتِ حالات کے مقابل فخر سے پیش کرتی ہیں۔ گھر، دفتر، رومانس، شادی، ذہن، جسم، حمل، جنس وغیرہ کے ساتھ ساتھ قومی و عالمی حوالے سے اپنے خالص فیمنائی اندازِ نظر کا اظہار ایک نئی عورت کی تشکیل کی نشاندہی ہے۔

یہی وہ عورت تھی جو آگے بڑھتے، تبدیلی پسند اور روشن خیال پاکستانی دور میں تشکیل پائی۔ یہی ادیب عورت ہمیں بیسویں صدی کے آخر تک عورت کے مسئلے پر واضح نقطہ نظر اختیار کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ''پچاس کی دہائی سے بیسویں صدی کی آخری دہائی تک ناول اور افسانے کے میدان میں عورتیں ہمیں مردوں کی ہمسری کرتی نظر آتی ہیں۔ ان ادیب خواتین نے اپنی تحریروں میں پدرسری خاندان کی متعین کردہ سماجی روایات ہی کو نہیں توڑا، وہ ہمیں ریاست سے بھی ٹکراتی نظر آتی ہیں۔'' (۱۴)

۱۹۷۷ کے بعد پاکستان کے دوسرے تشدد دور جعت پسند مذہبیت کے دور میں افغان مجاہدین سے طالبان دور تک پھیلے ریاستی مزاج نے جس ماحول اور نسل کو پروان چڑھایا اس میں پہلے جدید سیکولر دور کی خصوصیات ناپید تھیں۔ یہ فکری و ثقافتی طور پر پہلے دور سے مکمل طور پر کٹا ہوا تھا۔ اس دور میں جہاں ایک طرف متشدد مذہبیت، عدم برداشت اور غیر حقیقی رومانیت کے اثرات تحریروں پر آنے لگے۔ لڑکیوں کے سکولوں کو دھماکوں سے اڑایا جانے لگا۔

کاروکاری، تیزاب گردی، نسائی سمگلنگ، صنفی امتیاز اور تشدد عام ہوا۔ وہاں دوسری طرف عالمی طاقتوں اور اداروں کے دباؤ اور ترغیب پر میڈیا، این جی اوز اور تعلیمی اداروں میں فیمنیت اور اس کے عناصر کو فروغ دیا گیا۔ اسمبلیوں، سرکاری عہدوں اور فلاحی اداروں میں عورتوں کی نشستیں مخصوص کی گئیں اور عورتوں کے حوالے سے قانون سازی کی گئی۔ اشتراکی روس کے خاتمے کے بعد اس سماجی ماحول میں ایک مکمل ورلڈ ویو کی جگہ مابعد جدیدیت کی فکری ریزہ خیالی کو دی گئی۔ نیا ماحول اسی تضاد اور کشمکش کا نتیجہ بنا جس نے نئی ادیب نسل کو اپنا وژن، ورلڈ ویو اور فکری زاویہ بنانے میں رکاوٹیں کھڑی کیں۔ یہی وجہ ہے کہ عورت، اس کی تعلیم، خودمختاری اور آزادی کے مسئلے پر ہمارا معاشرہ واضح طور پر تقسیم کا شکار نظر آتا ہے جن کے درمیان نظریاتی تفاوت اور فکری کنفیوژن دونوں بڑھ رہے ہیں۔ کیونکہ مذہبی لبادے میں چھپے قبائلی و جاگیردارنہ پدری اقدار کی شکست کے بنا عورت کی آزادانہ سماجی بقا سوالات کی زد میں ہے۔ فیمنائی تصور و ادب کی حامی آوازیں اقلیت میں بدل رہی ہیں۔ اردو ادب کی تاریخیں اور ناقدوں کی فہرستیں اٹھا کر دیکھ لیں صورتحال آپ کے سامنے آجائے گی۔ بقول شاہدہ حسن:

پاکستان میں نسائی ادب کے حوالے سے بات کرتے ہوئے مجھے صورتحال بڑی غیر واضح آتی ہے۔ تعلیم اور معاشی آزادی کی طرف پیش رفت کے باوجود ہمارے پاکستانی معاشرے میں عورت کے وجود کو تخلیقی اظہار کے حوالے سے کسی کھلی فضا میں موجود ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ پاکستانی معاشرہ آج بھی قدیم روایات، علاقائی رسم ورواج اور مذہبی عقائد واقدار کی کھینچی ہوئی سرحدوں کے اندر محبوس ہے اور سیاسی اور سماجی سطح پر بھی جبر وگھٹن کی فضا موجود ہے۔(۱۵)

گو اب ۱۹۷۷ء کے بعد کی صورت حال میں تشکیل پانے والی عام عورت اپنے سے پہلی نسل کی عورتوں سے مختلف ہے لیکن نئی تعلیم، عالمی میڈیا اور سماجی سیاسی تضادات نے شہروں کے اندر اقلیتی سطح پر عورتوں کے ایک ایسے گروہ کو بھی ابھارا ہے جو فیمینائی نظریے پر مکمل طور پر باشعور ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر پاکستانی معاشرہ آج بھی عورت کے لئے تعلیم، روزگار، صحت، تحفظ، احترام، آزادی، مساوات، عدل اور سماجی معاملات پر اسے کچھ دینے کو تیار نہیں۔ معاشرے میں قائم مذہبی انتہا پسندی عورت پر کنٹرول کو مضبوط تر کر رہی ہے۔ ریاست اس حوالے سے حوصلہ افزا اقدامات کی طرف نہیں بڑھ پا رہی۔ میڈیا اپنی تجارتی اہداف کے باعث عورت کو ایک اقتصادی آلے سے زیادہ اہمیت نہیں دے رہا۔ جبکہ ادیب عورت کی ایک روایتی عکاسی تو کر رہے ہیں لیکن ان میں اس حوالے سے ایک بھرپور توجہ حاصل کر سکنے والی مزاحمت، کاٹ اور آواز بھی غائب ہے اور وہ مشاہدہ و جرأت بھی جو ان چھپے ہوئے کریہہ اور ناقابل برداشت منظروں کو ادب کا حصہ بنا سکے۔

حوالہ جات

۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی تحریکیں''، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۴۵۰

۲۔ علی سردار جعفری، ''ترقی پسند ادب''، مکتبہ کاروان، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱۸۷

۳۔ محمد حسن، ڈاکٹر، ''اردو ادب میں رومانوی تحریک''، ملتان، کارروان ادب، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱۰

۴۔ شبنم آرا، ''تانیثیت کے مباحث اور اردو ناول''، دلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۴

۵۔ نسرین انجم بھٹی، ''چند سوال''، مشمولہ ''ادب کی نسائی رد تشکیل''، مرتبہ: فہمیدہ ریاض، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۰۹

۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۶۰۱، ۶۰۰

۷ زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زنداں، کراچی، سٹی بک پوائنٹ، بار دوم، ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۴

۸۔ حمزہ علوی، تخلیق پاکستان (تاریخی وسماجی مباحث) ترجمہ ڈاکٹر ریاض احمد شیخ، تاریخ پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۱۰

۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ''، ص ۶۰۲

۱۰۔ کلیم حاذق، اردو شاعری کے فکری رویے، مشمولہ شبنم آرا، ''تانیثیت کے مباحث اور اردو ناول، ص ۱۳۷

۱۱۔ عتیق اللہ، ''خواتین کی نظموں میں فکر کے اسالیب'' بحوالہ شبنم آرا، ''تانیثیت کے مباحث اور اردو ناول'' ص ۱۲۶
۱۲۔ سیمون دی بوا، عورت، مترجم: یاسر جواد، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۳۱

۱۳۔ بادشاہ منیر بخاری، ''اردو ادب میں عورت کا تصور مرد کی نظر میں'' مشمولہ ''ادب کی نسائی رد تشکیل''، مرتبہ: فہمیدہ ریاض،، ۱۴۷
۱۴۔ زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زنداں، سٹی بک پوائنٹ، کراچی، بار دوم، ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۴
۱۵۔ شاہدہ حسن، نسائی شعور زندگی، مشمولہ خاموشی کی آواز، مرتبہ فاطمہ حسن، آصف فرخی، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۲۰۰۳ء، ص ۲۱